علوی فقہ حکمرانی کی روشنی میں ثقافتی یلغار کا تدارک، فکری تحفظ سے تمدن سازی تک

محقق: محمد صادق جعفری (صادق الوعد)، قم، ایران

خلاصۂ تحقیق

یہ تحقیقی مقالہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے فکری و نظریاتی نظام سے ایک جامع اور اسٹریٹجک نمونۂ عمل (ماڈل) اخذ کرنے کے درپے ہے، تاکہ عصر حاضر میں ثقافتی یلغار اور جنگ نرم (Soft War) کے فکری چیلنجز کا مؤثر مقابلہ کیا جاسکے۔ مقالے کا بنیادی مفروضہ اس امر پر استوار ہے کہ نہج البلاغہ محض ایک تاریخی یا اخلاقی دستاویز نہیں ہے، بلکہ دورِ حاضر کے پیچیدہ فکری اور تشخصی (ہویتی) حملوں کے سدِّ باب کے لیے ایک جامع اسٹریٹجک چارٹر اور ہمہ جہت نقشۂ راہ (روڈ میپ) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحقیق میں اولا ثقافت، تمدن، ثقافتی یلغار اور نرم جنگ جیسے بنیادی مفاہیم کی علمی تبیین و تشریح کی گئی ہے۔ بعد ازاں جنگِ نرم کے چار بنیادی عناصر ــــ یعنی:) غیر مرئی اور مخفی ماہیت، تدریجی اور دھیمی رفتار، فکری و ثقافتی تشخص کو ہدف بنانا، اور پُر کشش و فریب کار وسائل و ابزار سے استفادہ ــــ کا باریک بینانہ تجزیہ کیا گیا ہے اور یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ امام علی علیہ السلام نے چودہ سو سال قبل اپنے فرامین و خطبات میں انتہائی نفاست و بصیرت کے ساتھ ان پہلوؤں کی نشاندہی فرمائی تھی۔

مقالے کا مرکزی حصہ علوی حکمتِ عملی کے دو سطحی تجزیے پر مشتمل ہے: دفاعی حکمتِ عملی: یعنی بصیرت، تقوی، سادگی (سادہ زیستی) اور سماجی ہم آہنگی و یکجہتی کے ذریعے اندرونی محاذ کو مستحکم و ناقابلِ تسخیر بنانا۔ -اقدامی و پیشگی (ہجومی) حکمتِ عملی: یعنی دشمن کی فکری بنیادوں پر کاری ضرب لگانے کے لیے جہاد تبیین، باطل کے فریب کار چہرے کی نقاب کشائی اور ایک برتر ثقافتی و تمدنی نمونہ پیش کرنا۔ تحقیق کے نتائج یہ ظاہر کرتے ہیں کہ منہج علوی مسلم معاشرے کو انفعالی کیفیت اور مدافعت کی پوزیشن سے نکال کر ایک متحرک، بااثر اور تمدن ساز قوت میں تبدیل کر دیتا ہے، جو بالآخر اسلامی معاشروں کے ثقافتی استحکام و پائیداری کی ضامن بنتی ہے۔

کلیدی الفاظ:
نہج البلاغہ، ثقافتی یلغار، جنگِ نرم، دفاعی حکمت عملی، اقدامی حکمتِ عملی، بصیرت۔

پیش گفتار

عصر حاضر جہاں باہمی ثقافتی رابطوں کی تیز رفتار ترقی کا دور ہے، وہیں یہ پیچیدہ اور نرم تمدنی آویزشوں کا میدانِ کارزار بھی ہے۔ اس فضا میں وہ مظہر جسے ثقافتی یلغار یا "جنگِ نرم" سے تعبیر کیا جاتا ہے، معاشروں ـــ بالخصوص آزاد دینی و تمدنی تشخص کے حامل سماج ـــ کے لیے ایک بنیادی اور سنگین چیلنج بن چکا ہے۔ یہ یلغار روایتی عسکری جنگ کے برعکس، کسی معاشرے کے عقائد، اقدار اور طرزِ زندگی (طرزِ حیات) کی قلبِ ماہیت پر مرکوز ہے اور اس راہ میں جدید، پرکشش اور فریب کار وسائل و ذرائع کو بروئے کار لاتی ہے۔

اگرچہ یہ مظہر اپنی جدید صورت میں عالمی ذرائع ابلاغ اور بین الاقوامی ذرائع ترسیل کی پیداوار ہے، تاہم اس کی جڑیں حیاتِ انسانی کے آغاز سے حق و باطل کے دیرینہ تاریخی تقابل سے پیوستہ ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کو اپنے دورِ حکومت کے مختصر مگر پرآشوب ایام میں تاریخِ اسلام کے شدید ترین نفسیاتی اور ثقافتی معرکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف آپؑ کو شام میں معاویہ کی اس پروپیگنڈا مشینری سے نبرد آزما ہونا پڑا جو زر، تزویر اور جعلِ حدیث کے بل بوتے پر حقائق کو مسخ کر کے پیش کر رہی تھی، تو دوسری جانب خوارج کی تحجر پسند اور کج فکر جماعت درپیش تھی جو احکامِ شریعت کے جاہلانہ فہم کی بنا پر معاشرے کے فکری ارکان کو متزلزل کر رہی تھی۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نے ان ثقافتی اور فکری فتنوں کی جڑوں کا حقیقت پسندانہ اور گہرا تجزیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: «إِنَّمَا بَدْءُ وُقُوعِ الْفِتَنِ أَهْوَاءٌ تُتَّبَعُ، وَ أَحْكَامٌ تُبْتَدَعُ، يُخَالَفُ فِيهَا كِتَابُ اللّهِ، وَ يَتَوَلَّى عَلَيْهَا رِجَالٌ رِجَالًا عَلَى غَيْرِ دِينِ اللّهِ» (شریف الرضی ۱۴۱۴ھ، خطبہ ۵۰، ص۸۸)۔ (فتنوں کے آغاز کا اصل سبب وہ نفسانی خواہشات ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے اور وہ خود ساختہ احکام (بدعات) ہیں جو وضع کیے جاتے ہیں؛ ایسے احکام جن میں کتابِ الٰہی کی مخالفت کی جاتی ہے اور کچھ لوگ دینِ خدا کے علاوہ دیگر بنیادوں پر ایک دوسرے کی سرپرستی اور تسلط حاصل کر لیتے ہیں)۔

یہ تحقیق اس بنیادی سوال کا علمی جواب تلاش کرنے کے درپے ہے کہ: عصرِ حاضر میں ثقافتی یلغار کے جدید اور ہمہ جہت ابعاد کے مقابلے کے لیے سیرت اور کلامِ امیر المؤمنین علیہ السلام کو ایک جامع، عملی اور اسٹریٹجک نقشۂ راہ (روڈ میپ) کے طور پر کس طرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے؟

تحقیق کی اہمیت اور ضرورت

عصرِ حاضر میں "ثقافتی عالمگیریت" استکباری قوتوں کا ایک نہایت مؤثر اور تسلط پسندانہ ہتھیار بن چکی ہے۔ "جنگِ نرم" کے تناظر میں ثقافتی یلغار کوئی عارضی یا وقتی حادثہ نہیں ہے، بلکہ ایک پیچیدہ، باہم مربوط اور مسلسل عمل ہے جس کا حتمی مقصد معاشروں کی داخلی و باطنی قلبِ ماہیت اور اقوام کے ادراکی نظام و اقدار کے ذوق کو یکسر بدل ڈالنا ہے۔ اس نوع کے ہمہ گیر حملے کے روبرو محض دفاعی اقدامات پر اکتفا کرنا یا محض ردِ عمل پر مبنی انفعالی رویہ اختیار کرنا تدریجی ثقافتی پسپائی کے سوا کچھ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا۔

اس تحقیق کی بنیادی ضرورت اس حقیقت سے جنم لیتی ہے کہ ثقافتی انفعالیت سے نکل کر پیشگی اور تمدن ساز فعالیت کی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک مربوط، مضبوط اور خود کفیل فکری و علمی نظام ناگزیر ہے۔ نہج البلاغہ ـــ جو عقلانیت علوی کا مظہرِ اتم ہے ـــ محض ایک اخلاقی متن یا تاریخی پند نامہ نہیں ہے، بلکہ بڑے سماجی اور سیاسی بحرانوں سے نجات پانے کا ایک اسٹریٹجک چارٹر ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے عہد کے فتنوں کے مقابلے میں "ثقافت کی اسٹریٹجک مینجمنٹ" کا ایک جامع ماڈل پیش فرمایا؛ ایک ایسا نمونہ جس میں بصیرت افروزی اور داخلی مصونیت سازی (دفاعی محاذ) کو ماہیت باطل کی نقاب کشائی اور دشمن کی فکری بنیادوں کی شکست و ریخت" (اقدامی و ہجومی محاذ) کے ساتھ باہم مربوط و ہم آہنگ رکھا گیا۔ ان عناصر کا از سر نو مطالعہ، استخراج اور نمونہ سازی (ماڈلنگ)، اسلامی معاشروں کی ثقافتی پالیسی سازی کے لیے ایک نہایت مستحکم اور ناگزیر بنیاد فراہم کرتی ہے۔

مفاہیم شناسی اور نسب نامہ (تبار شناسی)

اس تمدنی معرکے کا باریک بینانہ تجزیہ، عمرانیاتی اور انسانی علوم کی اصطلاحی لغت میں بنیادی مفاہیم کی دقیق صورت گری اور ان کے مابین ساختاری نسبت کی وضاحت کا متقاضی ہے:

(الف) ثقافت بمقابلہ تمدن

عمرانیات اور ثقافتی مطالعات کے علمی دائرۂ کار میں ثقافت اور تمدن کے مابین حدِ فاصل قائم کرنا نہایت حیاتی اور بنیادی امر ہے:

ثقافت: انسانی حیات کے معنوی، باطنی اور اقدار پر مبنی پہلو کو تشکیل دیتی ہے؛ یعنی عقائد، افکار، تصورات اور اقدار کا وہ مجموعہ جو کسی بھی معاشرے کی بنیادی شناخت اور تشخص کو سنوارتا اور برقرار رکھتا ہے۔ علامہ محمد تقی جعفری ایک جامع تعریف پیش کرتے ہوئے ثقافت کو یوں بیان کرتے ہیں: ثقافت سے مراد انسانوں کی حیاتِ معقول کا وہ پسندیدہ اور شائستہ طریقہ ہے، جو ایک مخصوص جہان بینی اور کائنات شناسی کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے (جعفری ۱۳۷۳، ۳۵)۔ چنانچہ ثقافت کو معاشرے کا سافٹ ویئر قرار دیا جا سکتا ہے۔

تمدن: انسانی حیات کے مادی، عینی، ادارہ جاتی اور ساختاری مظاہر کا نام ہے؛ یعنی وہ منظّم نظام جو سیاسی، معاشی، قانونی اور ٹیکنالوجیکل شعبوں میں ثقافت کے عملی اور خارجی ظہور کی نمائندگی کرتا ہے۔ ول ڈیورنٹ کی تعبیر کے مطابق: تمدن درحقیقت ایک ایسا سماجی نظم ہے جس کی بدولت ثقافتی تخلیق پذیری ممکن ہو پاتی ہے (دورانت ۱۳۶۵، ۱: ۳)۔ تمدن معاشرے کے لیے ہارڈ ویئر کی حیثیت رکھتا ہے۔

ثقافت اور تمدن کے باہمی تعلق کی نوعیت روح اور جسم کی سی ہے۔ یہ نامیاتی ربط قرآنی تمثیل شجرۂ طیبہ میں ایک قدسی جلوہ اختیار کرتا ہے: أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (ابراہیم: ۲۴)۔

اس حکیمانہ تمثیل میں کلمۂ طیبہ (توحیدی جہان بینی اور الٰہی ثقافت) درخت کی غیر مرئی مگر حیات بخش جڑ کی مانند ہے؛ جبکہ تنا، شاخیں اور پھل (تمدنی نظامات، ساختاریں اور ادارے) اسی بستر سے غذا حاصل کرتے ہیں جو جڑ نے فراہم کیا ہے۔ چنانچہ جو تمدن اپنی ساختاری و تکنیکی وسعت (شاخ و

برگ) کے جنون میں مبتلا ہو جائے مگر اپنی باطنی، اخلاقی اور قدسی جڑوں سے غافل رہے، وہ گلدستے میں سجے اس پھول کی مانند ہے جس کا مقدر پژمردگی اور زوال کے سوا کچھ نہیں۔

(ب) ثقافتی تبادلہ بمقابلہ ثقافتی یلغار

ہر زندہ اور متحرک سماجی نظام اپنی بقا اور ارتقا کے لیے دیگر تمدنی حوزوں اور دائروں سے تعامل کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ آمنا سامنا دو متضاد صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے:

ثقافتی تبادلہ: یہ ایک فعال، آگاہانہ، دوطرفہ اور ہم افزا عمل ہے، جس میں ایک باوقار اور بااصالت ثقافت اپنی شناخت کے بنیادی مرکز اور اصالت کو کھوئے بغیر دیگر ثقافتوں کی مثبت اور معقول کامیابیوں کو ہضم کر کے، اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالتی اور باز تولید (دوبارہ پیدا) کرتی ہے۔ شہید مرتضیٰ مطہری اس عمل کو ایک جاندار کے نظامِ انہضام (دستگاہِ گوارش) سے تشبیہ دیتے ہیں؛ ایسا جاندار جو خارجی غذا کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی توانائی اور حیاتیاتی نظام کا جزو بنالیتا ہے، نہ یہ کہ وہ خود ہی اس غذا میں تحلیل و مستحیل ہو جائے (مطہری ۱۳۷۴، ۴۵)۔

ثقافتی یلغار: اس کے برعکس، یہ ایک جبری، منظّم، ہیرپھیر پر مبنی اور بالادستی کا خواہاں عمل ہے، جس کے دوران استکباری و تسلط پسند نظام دانستہ طور پر اپنا اجنبی اقدار کا نظام مسلط کرنے اور ہدف بننے والے معاشرے کے تشخصی، روایتی اور دینی ڈھانچے کو مسمار کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ حتمی سیاسی و معاشی استیلا اور تسلط کی راہ ہموار کی جاسکے (مصباح یزدی ۱۳۸۰، ۷۸)۔ ثقافتی یلغار میں، تبادلے کے برعکس، اصل مقصود ملی و دینی تشخص کو مسخ کرنا اور ہدف بننے والے معاشرے کی کسی مزاحمت کے بغیر غالب نظامِ حیات کے نمونوں کو ان کی جگہ متمکن کرنا ہوتا ہے" (خامنہ ای ۱۳۹۲، ۶۲)۔

(ج) اپنی شناخت، فکری اصلاح اور جدید تقاضوں کے درمیان توازن کا معیار

اجنبی ثقافتوں سے ٹکراؤ کی اس کشمکش میں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ: وہ علمی و عملی پیمانہ اور میزان کیا ہے جس کی بنیاد پر امرِ اصیل و قابلِ حفاظت، پیرائش و اصلاح کے محتاج امور، اور قابلِ قبول نوآوری وجدت میں تمیز کی جاسکے؟ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام اپنے تاریخی عہد نامے میں روایات و رسوم کے ارزیابی کے معیارات اور ارتقائی تحول کی حدود کو یوں بیان فرمایا ہے: «وَ لاَ تَنْقُضْ سُنَّةً صَالِحَةً عَمِلَ بِهَا صُدُورُ هَذِهِ الأُمَّةِ، وَ اجْتَمَعَتْ بِهَا الأُلْفَةُ، وَ صَلَحَتْ عَلَيْهَا الرَّعِيَّةُ. وَ لاَ تُحْدِثَنَّ سُنَّةً تَضُرُّ بِشَيْءٍ مِنْ مَاضِي تِلْكَ السُّنَنِ، فَيَكُونَ الأَجْرُ لِمَنْ سَنَّهَا [وَ الْوِزْرُ عَلَيْكَ بِمَا نَقَضْتَ مِنْهَا» (شریف الرضی ۱۴۱۴، مکتوب ۵۳، ص ۴۳۲)۔ (اور کبھی کسی ایسے نیک اور پسندیدہ دستور کو مت توڑنا جس پر اس امت کے اسلاف اور معززین نے عمل کیا ہو، جس کے سبب لوگوں کے درمیان الفت و باہمی ربط استوار ہوا ہو، اور جس کے سائے میں رعیت کے حالات سنور گئے ہوں۔ اور خبردار! کوئی ایسا نیا طریقہ ایجاد نہ کرنا جو گزشتہ نیک رسموں میں سے کسی کو نقصان پہنچائے؛ ورنہ اجر اس پہلے بانی کا ہوگا اور اس نیک روایت کو توڑنے کا گناہ تمہاری گردن پر ہوگا)۔

یہ نورانی فراز در حقیقت تحفظِ اصالت اور پذیرشِ ارتقا و نوآوری کے مابین توازن کا بنیادی دستور العمل ہے۔ امام علیہ السلام نے لفظ صَالِحَۃ کی قید لگا کر اندھی تقلید اور ہر پرانی رسم کی جمود آمیز تقدیس سے روکا ہے، اور کسی بھی روایت و سنت کی بقا اور اعتبار کے لیے تین غیر منفک ارکان متعین فرمائے ہیں: «عَمِلَ بِهَا صُدُورُ هَذِهِ الأُمَّةِ»: وہ طریقہ، رسم یا قدر معاشرے کی اجتماعی عقل، داناؤں کی حکمت اور صالح رہنماؤں کی ہدایت سے پھوٹی ہو؛ یعنی وہ آزمودہ کار ہو اور تاریخ کی کسوٹی پر اپنی افادیت ثابت کر چکی ہو۔

«وَ اجْتَمَعَتْ بِهَا الأُلْفَةُ»: اس روایت کا بنیادی خاصہ یہ ہو کہ وہ سماجی سرمایہ اور باہمی الفت پیدا کرے، نہ یہ کہ وہ قبائلی کینوں، نسلی و طبقاتی تفریق اور انتشار کی آگ بھڑکائے۔ ہر وہ رسم جو سماجی رشتے توڑنے کا باعث بنے، وہ صفت صالح سے عاری ہے۔

«وَ صَلَحَتْ عَلَيْهَا الرَّعِيَّةُ»: اس قاعدے کا حتمی نتیجہ عوام کے مسائل کا حل، عدل کا پھیلاؤ اور معاشرے کی درستی پر منتج ہو۔ چنانچہ جس رسم کا انجام جہالت کا فروغ، ظلم کا تسلسل یا غربت کا بوجھ ہو، اسے باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

یہ منطقی تجزیہ روایتی اندھی تقلید، موہوم پرستش اور غیر لچکدار خرافات پر گہری ضرب ہے؛ کیونکہ جس رسم کی توثیق اہلِ دانش نہ کریں، جو تفریق ڈالے اور معاشرے کے بگاڑ کا سبب بنے، وہ ایک مردہ اور نقصان دہ روایت ہے جس کا خاتمہ یا تعمیرِ نو ناگزیر ہے۔

کلام کے دوسرے حصے میں امام علیہ السلام تمدنی ارتقا اور تبدیلی کے انتظام کا ایک درخشاں اصول بیان فرماتے ہیں: «وَ لاَ تُحْدِثَنَّ سُنَّةً تَضُرُّ بِشَيْءٍ مِنْ مَاضِي تِلْكَ السُّنَنِ»-

یہ فرمان واضح کرتا ہے کہ اسلام نہ تو ترقی پسندانہ جدت طرازی، آلہ جاتی عقلانیت اور تعمیری تغیر کا مخالف ہے، اور نہ ہی ان بے اصول و بے مہار تبدیلیوں کا حامی ہے جو معاشرے کے سابقہ تعمیری تشخص کو برباد کر دیں۔ مطلوبہ تحول وہی ہے جو اصالت پر مبنی تغیر ہو؛ یعنی نئی ساختیاتی اختراعات کو ماضی کے اخلاقی مفاخر، الٰہی بنیادوں اور وحدت بخش اقدار کے کھنڈرات پر تعمیر نہیں کیا جانا چاہیے۔

اس اساس پر، علوی ماڈل عالمی تعاملات اور ثقافتی یلغار کے مقابلے میں مسلم معاشرے کی ذمہ داری کو ایک ہوشمند باغبان کے فرائض سے تشبیہ دیتا ہے: یعنی بارآور اور جڑدار درختوں (صالح و تعمیری روایات) کی آبیاری اور تحفظ۔ یعنی مفید عالمی سائنسی و تمدنی ثمرات اور نئے پودوں کی پیوند کاری، مگر اس انداز سے کہ قدیم بااصالت درختوں کی جڑوں اور زمین کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

علوی فقہ الحکمرانی کی روشنی میں ثقافتی یلغار کا گہرا تجزیہ

ثقافتی یلغار یا جنگ نرم ایک کثیر جہتی، کثیر لایہ اور انتہائی پیچیدہ اسٹریٹجی ہے جو براہ راست انسانوں کی عقلانیت، جذبات، اقدار کے نظام اور تاریخی و تہذیبی تشخص کو نشانہ بناتی ہے۔ اس نوعیت کی جنگ کے باطنی طریقہ کار کو کماحقہ سمجھنے کے لیے عصرِ حاضر کے شواہد اور امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے کلامی و فکری نظام کے تقابلی جائزے کی روشنی میں اس کی بنیادی خصوصیات کا تجزیہ ناگزیر ہے:

۱۔ غیر مرئی، مخفی اور نامحسوس ماہیت

جنگ نرم کی سب سے خطرناک اور مہلک ترین خصوصیت اس کی پوشیدہ، بالواسطہ اور زیرِ زمین نوعیت ہے۔ روایتی عسکری جنگ کے برعکس، یہ نبرد جغرافیائی سرحدوں یا کھلے میدانِ کارزار میں واقع نہیں ہوتی؛ بلکہ اس کا محاذ خاندانی کانون، افراد کی خلوت، میڈیا کے بستر اور سینما ہالز میں قائم ہے۔ اس محاذ کے ہتھیار دراصل ثقافتی مصنوعات، فلمیں، ڈرامے اور سیریلز، ویڈیو گیمز، موسیقی اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز ہیں؛ یعنی وہ وسائل جو بظاہر محض تفریحِ طبع اور اوقات گزاری کے لیے تیار کیے جاتے ہیں، لیکن اپنے باطن میں گہرے نظریاتی پیغامات، تشخصی دلالتیں اور ایک مخصوص طرزِ زندگی لیے ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر دورِ حاضر کے ایک عالمی اور مقبول ترین سیریل کو مدنظر رکھیے، جس میں انتہا پسندانہ فرد پرستی، لذت پرستی اور خانوادگی وازدواجی تقدس کی فرسودگی کو فطری، جدید اور روشن خیالی کے علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ناظر ڈرامائی کرداروں کے ساتھ جذباتی ہم آہنگی قائم کرتے ہوئے غیر شعوری طور پر ان پیغامات کو اپنے اندر جذب اور باطنی بنالیتا ہے۔

یہ طریقہ کار انتونیو گرامشی کے نظریہ ثقافتی بالادستی سے مکمل مطابقت رکھتا ہے؛ وہ عمل جس میں حاکم اور بالادست قوت اپنی اقدار اور معیارات کو عسکری طاقت اور کھلے جبر کے ذریعے نہیں، بلکہ نارملائزیشن (عام اور فطری بنادینے) اور نرم وتدریجی قائل سازی کے ذریعے معاشرے پر مسلط کرتی ہے، یہاں تک کہ یہ اقدار ہدف بننے والے معاشرے کی عام عقل کا حصہ بن جاتی ہیں (گرامشی ۱۹۷۱، ۱۸۱)۔

اس عمل میں نشانہ بننے والا فرد یہ قطعی محسوس نہیں کرتا کہ وہ کسی حملے کی زد میں ہے، اور یہی بے خبری درحقیقت اس کے فکری دفاعی خطوط کو غیر مسلح اور بے بس کر دیتی ہے۔

علامہ محمد باقر مجلسی فتنوں اور بدعتوں کے ابواب میں ائمہ معصومین علیہم السلام کی متعدد روایات نقل کرتے ہیں جن میں شیطان اور دشمنانِ دین کے باطل کو حق کا لبادہ اوڑھا کر خوشنما بنانے کے حربوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جو کہ خطبہ ۵۰ کی براہِ راست تائید و تکمیل کرتی ہے۔ کفر وایمان کے تاریخی تقابل میں افکارِ عامہ کو فریب دینے کے لیے حق و باطل کی باہمی آمیزش ہی اصل حربہ رہی ہے (مجلسی ۱۴۰۳ھ، ۲: ۳۰۸)۔

چودہ سو سال قبل امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے اس مکارانہ حربے کی نقاب کشائی کرتے ہوئے حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرنے کو تمام تر فتنوں کی جڑ قرار دیا تھا۔ اگر باطل بالکل برہنہ اور خالص صورت میں سامنے آئے تو معاشرہ اسے فوراً پہچان کر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لے؛ لیکن جب باطل کو پرفریب کشش، فنکارانہ علامتوں اور آزادی کے خوشنما نعروں کے غلاف میں لپیٹ کر پیش کیا جائے تو اس کی تمیز دشوار ترین ہو جاتی ہے:«... وَ لَكِنْ يُؤْخَذُ مِنْ هَذَا ضِغْثٌ وَ مِنْ هَذَا ضِغْثٌ فَيُمْزَجَانِ! فَهُنَالِكَ يَسْتَوْلِي الشَّيْطَانُ عَلَى أَوْلِيَائِهِ...» (شريف الرضى ١٤١٤، خطبه ٥٠، ص٨٨)-(*...لیکن [فتنہ پرور] تھوڑا سا حق لیتے ہیں اور تھوڑا سا باطل، اور پھر دونوں کو باہم آمیز کر دیتے ہیں؛ بس یہی وہ وقت ہوتا ہے جب شیطان اپنے پیروکاروں اور دوستوں پر مکمل مسلط ہو جاتا ہے*)۔

۲۔تدریجی، مسلسل اور مرحلہ وار ماہیت

جنگِ نرم کوئی فوری، برق رفتار اور ناگہانی عمل نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طویل مدتی مہم اور رگ و پے میں سرایت کرنے والی حرکت ہے۔ ثقافتی انحطاط اور اقدار کی قلب ماہیت قطرہ قطرہ معاشرے کے جسم میں اتاری جاتی ہے تاکہ سماجی مدافعت کا مدافعتی نظام چوکنا نہ ہو اور مزاحمت پیدا نہ کر سکے۔ یہ حکمتِ عملی کھولتے پانی میں مینڈک (Boiling Frog Syndrome) کی تمثیل سے مکمل شباہت رکھتی ہے؛ اگر مینڈک کو اچانک ابلتے پانی میں ڈال دیا جائے تو وہ فوراً چھلانگ لگا کر باہر نکل جاتا ہے، لیکن اگر اسے ٹھنڈے پانی میں رکھ کر درجہ حرارت آہستہ آہستہ بڑھایا جائے تو وہ خطرے کا ادراک نہیں کر پاتا اور بے خبری میں لقمۂ اجل بن جاتا ہے۔

گزشتہ چند دہائیوں کے میڈیا کی مصنوعات میں پردے، بے حیائی، محرم و نامحرم کے روابط اور نجی و عمومی حدود کے بدلتے تصورات اس حقیقت کے واضح گواہ ہیں: وہ طرزِ عمل جو پہلی دہائی میں ایک قباحت اور اخلاقی حدود کی پامالی سمجھا جاتا تھا، دوسری دہائی میں ایک قابلِ بحث استثنا بن گیا، تیسری دہائی میں ایک خاص طبقے کا عام رواج بن گیا اور بالآخر ایک انتخابی اور جائز طرزِ زندگی کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ یہ تدریجی نارملائزیشن ہر نسل میں ایک نیا فکری نقطۂ آغاز پیدا کرتی ہے اور طویل مدت میں اخلاقی نظام میں مکمل تغیر برپا کر دیتی ہے؛ بغیر اس کے کہ معاشرے کو کوئی ناگہانی دھچکا محسوس ہو۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نے اس دھیمی اور رینگتی ہوئی رفتار کو "خطوات الشیطان" اور نامحسوس گزرگاہوں سے تعبیر فرمایا ہے۔ آپؑ خبردار کرتے ہیں کہ ثقافتی انحرافات یک دفعہ حملہ آور نہیں ہوتے بلکہ ابتدا میں مخفی راہوں سے داخل ہو کر اپنی بنیادیں مضبوط کرتے ہیں: «إِنَّ الْفِتَنَ إِذَا أَقْبَلَتْ شَبَّهَتْ، وَ إِذَا أَدْبَرَتْ نَبَّهَتْ؛ يُنْكَرْنَ مُقْبِلَاتٍ، وَ يُعْرَفْنَ مُدْبِرَاتٍ...» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۹۳، ص ۱۳۴)۔ *(فتنے جب آتے ہیں تو حق و باطل کو مشتبہ کر دیتے ہیں، اور جب پلٹ کر جانے لگتے ہیں تو حقیقت واضح کر کے متنبہ کرتے ہیں؛ آتے وقت وہ پہچانے نہیں جاتے اور جاتے وقت ان کی حقیقت عیاں ہوتی ہے)*۔

اسی طرح فتنوں کی نمو کے ارتقائی عمل کی تفصیلی تبیین کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «تَبْدَأُ فِي مَدَارِجَ خَفِيَّةٍ وَ تَئُولُ إِلَى فَظَاعَةٍ جَلِيَّةٍ، شِبَابُهَا كَشِبَابِ الْغُلَامِ وَ آثَارُهَا كَآثَارِ السَّلَامِ» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۱۵۱، ص ۲۱۲)۔ *(فتنے مخفی اور باریک گزرگاہوں سے شروع ہوتے ہیں اور بالآخر کھلی اور وحشت ناک رسوائی پر منتج ہوتے ہیں؛ ان کا عنفوان اور ابھار نوخیز نوجوان کی شادابی کی طرح [تیز رفتار اور دل فریب] ہوتا ہے اور ان کے تباہ کن آثار سخت اور کھردرے پتھروں کی ضرب کی مانند [کچل دینے والے] ہوتے ہیں)*۔

امام علی علیہ السلام نے اس کلامِ بلاغت نظام میں فتنے کی ماہیت اور نتائج کو دو بلیغ استعاروں سے واضح کیا ہے:

1. ابتدائی تیزی اور کشش («شِبَابُهَا كَشِبَابِ الْغُلَامِ»): فتنے کی تشکیل کا مرحلہ نوجوانی کے جوش اور تیزی کی طرح ہوتا ہے؛ یعنی وہ پرفریب، ہیجان انگیز اور پرکشش نعروں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور عوام کو اپنے ظاہری خدوخال سے مسحور کر لیتا ہے۔

2. انجام کی ہولناک ویرانی («آثَارُهَا كَآثَارِ السِّلَامِ»): لفظ سلام لغت میں سخت، بھاری اور کھردرے پتھروں کو کہا جاتا ہے (ابن منظور ۱۴۱۴ھ، ۱۲: ۲۹۵)۔ فتنے کا انجام، معاشرے میں مکمل طور پر سرایت کر جانے کے بعد، ایک وزنی چٹان کے گرنے کے مانند ہوتا ہے جو معاشرے کی فکری ہڈیوں اور تشخصی ڈھانچے کو چکنا چور کر دیتا ہے؛ جیسا کہ فتنۂ بنی امیہ اور خوارج کے انحرافی طوفانوں میں دیکھا گیا۔

اس ثقافتی یلغار کا شکار سب سے زیادہ وہ ناآگاہ، سطحی اور تنقیدی فکر سے عاری عوام ہوتے ہیں جو محض وقتی ہیجانات کے پیچھے چلتے ہیں۔ حضرت نے ایسے طبقے کو «هَمَجٌ رَعَاعٌ» (ہوا میں اڑنے والے خس و خاشاک یا مچھر) سے تعبیر فرمایا ہے: «...وَ هَمَجٌ رَعَاعٌ، أَتْبَاعُ كُلِّ نَاعِقٍ، يَمِيلُونَ مَعَ كُلِّ رِيحٍ؛ لَمْ يَسْتَضِيئُوا بِنُورِ الْعِلْمِ، وَ لَمْ يَلْجَئُوا إِلَى رُكْنٍ وَثِيقٍ» (شریف الرضی ۱۴۱۴، حکمت ۱۴۷، ص ۴۹۵)۔ *(...اور تیسرا گروہ وہ بے بصیرت اور سرگرداں عوام ہیں جو ہر پکارنے والے کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور ہر ہوا کے رخ پر مڑ جاتے ہیں؛ نہ تو وہ علم کے نور سے منور ہوئے ہیں اور نہ ہی انہوں نے کسی مضبوط سہارے کی پناہ لی ہے)*۔

۳۔ مرکز تشخص اور نظام خودآگاہی پر حملہ

جنگِ نرم کا اصل اور حتمی ہدف سطحی یا جزوی رویوں کو بدلنا نہیں ہے، بلکہ اس کا بنیادی مقصد معاشرے کے فردی اور اجتماعی تشخص (Identity) کے مرکز کو فتح کرنا ہے۔ اس جنگ کا حقیقی جغرافیہ اذہان و قلوب کی قلمرو ہے۔ حملہ آور کی اسٹریٹجی یہ ہوتی ہے کہ وہ اصیل تشخصی روابط (دینی، تاریخی، قومی اور خاندانی) کو فرسودہ اور کمزور کرے اور ان کی جگہ ایک، تنہا، عالمگیریت کا شکار اور بے مہار اسرافیت پر مبنی شناخت رائج کرے۔ جب انسان اپنے تاریخی تشخص سے تہی دست ہو جاتا ہے تو وہ خود بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے؛ یعنی وہ کیفیت جس میں مفتوح فرد کائنات کو حملہ آور کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اسی کی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ساتویں خطبے میں ادراکی تسخیر اور تشخص کی قلب ماہیت کا حیرت انگیز اور دقیق نقشہ کھینچتے ہوئے باطل کے آلہ کار بن جانے والوں کی حالت یوں بیان فرماتے ہیں: «اتَّخَذُوا الشَّيْطَانَ لِأَمْرِهِمْ مِلَاكاً، وَ اتَّخَذَهُمْ لَهُ أَشْرَاكاً؛ فَبَاضَ وَ فَرَّخَ فِي صُدُورِهِمْ، وَ دَبَّ وَ دَرَجَ فِي حُجُورِهِمْ؛ فَنَظَرَ بِأَعْيُنِهِمْ، وَ نَطَقَ بِأَلْسِنَتِهِمْ...» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۷، ص ۵۳)۔ *(انہوں نے شیطان کو اپنے امور کا معیار اور تکیہ گاہ بنالیا اور اس نے بھی انہیں اپنا شریک کار بنالیا؛ پس اس نے ان کے سینوں میں انڈے دیے اور بچے نکالے، اور ان کی گودوں میں آہستہ آہستہ رینگ کر پروان چڑھا؛ یہاں تک کہ وہ ان کی آنکھوں سے دیکھنے لگا اور ان کی زبانوں سے بولنے لگا...)*۔

یہ کلام درحقیقت ادراکی اور معرفتی تسخیر کا بلند ترین درجہ بیان کرتا ہے۔ اس درجے پر پہنچ کر انسان اپنا بااصالت تشخص مکمل طور پر کھو بیٹھتا ہے اور دشمن کا بلا معاوضہ پیادہ بن جاتا ہے، درحالیکہ وہ اس فریبِ نظر کا شکار ہوتا ہے کہ یہ ظاہر ہونے والے افکار اس کی آزاد مرضی اور خود مختار فکر کی پیداوار ہیں۔

۴۔ جمالیاتی اور بصری کشش کا بطور ہتھیار استعمال

جنگِ نرم کا اصل ہتھیار عسکری جنگ کے برعکس جسمانی جبر یا عقلی و استدلالی قائل سازی نہیں ہے؛ بلکہ اغواکاری، سنسنی خیزی اور پیغام کی دلکش اور پرکشش پیکجنگ ہے۔ حملہ آور گروہ اپنے فکری سانچوں کو پرشکوہ بصری مصنوعات، تجملاتی اور تفریحی سانچوں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے تاکہ مخاطب کسی تنقیدی مزاحمت کے بغیر اس کا والہانہ استقبال کرے۔

عصرِ حاضر میں اس کا واضح ترین مظہر سوشل میڈیا بلاگرز اور سلیبریٹیز کا پیدار ہونا ہے۔ جدید مغربی طرزِ زندگی اپنے نظریاتی مبانی کو خشک فلسفیانہ فارمولوں کے بجائے روزمرہ کی زندگی کی پرکشش، شاداب اور بظاہر بے عیب تصاویر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ ان محرکات کے سامنے انسان کے حیوانی و غریزی رجحانات بیدار ہوتے ہیں اور پوشیدہ پیغامات بغیر کسی عقلی چھلنی کے قبول کر لیے جاتے ہیں۔

امام علی علیہ السلام نے متعدد مقامات پر دنیا کے فریب کار جلووں اور باطل کے مکارانہ ہتھکنڈوں کو ایک خوبصورت، رنگ برنگے، نرم اور خوش نما سانپ سے تشبیہ دی ہے جس کی جلد نرم مگر اندرون ہلاکت خیز زہر سے بھرا ہوتا ہے:

«مَثَلُ الدُّنْيَا كَمَثَلِ الْحَيَّةِ: لَيِّنٌ مَسُّهَا، وَ السَّمُّ النَّاقِعُ فِي جَوْفِهَا؛ يَهْوِي إِلَيْهَا الْغِرُّ الْجَاهِلُ، وَ يَحْذَرُهَا ذُو اللُّبِّ الْعَاقِلُ» (شریف الرضی ۱۴۱۴، حکمت ۱۱۹، ص ۴۹۰)۔ *(دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے؛ چھونے میں انتہائی نرم اور ملائم لیکن اس کا باطن قاتل زہر سے بھرا ہوا ہے؛ فریب خوردہ جاہل اس کی طرف لپکتا ہے جبکہ صاحبِ عقل و دانش اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے)*۔

ان چاروں خصوصیات (غیر مرئی پن، تدریجیت، شناخت کشی اور پرکشش ابزار سازی) کا باہمی امتزاج ایک ایسا بند ثقافتی ماحولیاتی نظام تشکیل دیتا ہے جس میں تسلط پسند ثقافت کسی اجنبی حملے کے بجائے ترقی، جدیدیت اور معقول زندگی گزارنے کے واحد پیمانے کے طور پر معاشرے میں جگہ بنا لیتی ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے فرامین کے مجموعے کا تجزیہ یہ واضح کرتا ہے کہ معاشروں کا تمدنی زوال دفعی اور اچانک نہیں ہوتا، بلکہ ایک سہ رخی اور زنجیر نما تدریجی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ بگاڑ ادراکی و فکری انحراف سے شروع ہوتا ہے، پھر اخلاقی زوال اور طرزِ زندگی کی تبدیلی میں سرایت کرتا ہے، اور بالآخر سماجی یکجہتی کے بکھراؤ اور مکمل سیاسی و تمدنی غلامی پر منتج ہوتا ہے۔

ثقافتی یلغار کی سہ سطحی لہریں

الف) معرفتی جنگ (معرکۂ شناخت)

ثقافتی یلغار کا بنیادی ترین اور عمیق ترین محاذ، جہان بینی کی بنیادوں اور معرفتی نظام پر حملہ آور ہونا ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی نگاہ میں معاشرے کے عظیم بحرانوں کا سرچشمہ ہتھیار اور تلواریں نہیں، بلکہ فکری انحرافات اور اعتقادی تزلزل ہے:

«إِنَّمَا بَدْءُ وُقُوعِ الْفِتَنِ أَهْوَاءٌ تُتَّبَعُ، وَ أَحْكَامٌ تُبْتَدَعُ؛ يُخَالَفُ فِيهَا كِتَابُ اللَّهِ، وَ يَتَوَلَّى عَلَيْهَا رِجَالٌ رِجَالاً عَلَى غَيْرِ دِينِ اللَّهِ» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۵۰، ص۸۸)۔(*فتنوں کے آغاز کا اصل سبب وہ نفسانی خواہشات ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے اور وہ نو پیدا و بدعت آمیز احکام ہیں جو گھڑ لیے جاتے ہیں؛ ایسے احکام جن میں کتابِ خدا کی مخالفت کی جاتی ہے اور کچھ گروہ دینِ خدا سے ہٹ کر، اس کی بنیاد پر باہم ایک دوسرے کی پشت پناہی اور تسلط کا فریضہ سنبھالتے ہیں*)۔

اس اسٹریٹجک اور جامع بیان میں حضرت دو بنیادی عوامل کی نشاندہی فرماتے ہیں:

1. «أَهْوَاءٌ تُتَّبَعُ» (پیروی کی جانے والی نفسانی خواہشات): لذت پرستانہ انفرادیت پسندی کی حاکمیت اور حیوانی خواہشات و جبلتوں کو اصالت دینا، جس کے نتیجے میں اقدار کی جانچ اور تشخیص کا معیار "وحیانی و قدسی عقل" کے بجائے "نفسانی خواہشات" کے ترازو میں بدل جاتا ہے۔
2. «أَحْكَامٌ تُبْتَدَعُ» (معاشرتی معیارات میں بدعت طرازی): شیطانی ثقافتی انجینئرنگ اور ایسے متبادل، غیر الٰہی قواعد و اقدار کا نفاذ جو معاشرے کے اخلاقی اور سماجی معیارات کو قعرِ مذلت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

اس فکری میدان میں دشمن کا عملیاتی ہتھیار شبہہ اندازی ہے؛ ایک ایسا حربہ جو حق و باطل کے درمیان امتیازی حد کو تاریک اور مبہم کر دیتا ہے: «وَ إِنَّمَا سُمِّيَتِ الشُّبْهَةُ شُبْهَةً لِأَنَّهَا تُشْبِهُ الْحَقَّ؛ فَأَمَّا أَوْلِيَاءُ اللَّهِ فَضِيَاؤُهُمْ فِيهَا الْيَقِينُ...» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۳۸، ص۸۱)۔(*شبہے کو شبہہ اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ حق سے مشابہت رکھتا ہے؛ لیکن اللہ کے دوستوں کے لیے شبہات کی تاریکی میں رہنمائی کا چراغ، نورِ یقین ہے...*)۔

حملہ آور گروہ کبھی بھی باطل کے عنوان کے ساتھ میدان میں نہیں اترتا؛ بلکہ وہ تباہ کن اور اخلاق سوز نظریات کو آزادی، انسانی حقوق اور ترقی و ماڈرنائزیشن" جیسے مقدس اور پرفریب الفاظ کی پیکجنگ میں پیش کرتا ہے تاکہ دانشوروں اور عامۃ الناس کی ذہنی مزاحمت کو آسانی سے توڑا جا سکے۔

ب) اخلاقی لایہ اور طرز زندگی

عقائد میں نقب زنی کے بعد، ثقافتی یلغار کا دوسرا قدم روزمرہ کے معمولات، عملی رویوں اور طرزِ زندگی کی تبدیلی ہے۔ جو معاشرہ عیش و عشرت، تعیش پسندی، بے جا صارفیت اور تن آسانی کا خوگر ہو جائے، وہ بیرونی تسلط کے خلاف مزاحمت کی تاب نہیں لا سکتا۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کا عثمان بن حنیف کے نام تاریخی مکتوب محض ایک دفتری سرزنش یا انفرادی اخلاقی نصیحت نہیں ہے، بلکہ اشرافیہ پسندی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انحطاط کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کی مصونیت سازی کا دستور العمل) ہے۔ حضرت بصرہ کے اشرافیہ کی دعوت میں ان کی شرکت پر توبیخ فرمانے کے بعد، معاشرے کے قائد اور راہنما کی حیاتِ طیبہ کا منطقی خاکہ پیش کرتے ہیں: «أَلَا وَ إِنَّ إِمَامَكُمْ قَدِ

اکْتَفَی مِنْ دُنْیَاهُ بِطِمْرَیْهِ، وَ مِنْ طُعْمِهِ بِقُرْصَیْهِ؛ أَلَا وَ إِنَّکُمْ لَا تَقْدِرُونَ عَلَی ذَلِکَ، وَ لَکِنْ أَعِینُونِی بِوَرَعٍ وَ اجْتِهَادٍ، وَ عِفَّةٍ وَ سَدَادٍ» (شریف الرضی ۱۴۱۴، مکتوب ۴۵، ص ۴۱۷)۔ *(آگاہ رہو! تمہارے امام نے اپنی دنیا سے دو پرانے کپڑوں اور اپنی غذا سے دو روٹیوں پر قناعت کر لی ہے۔ خبردار! تم اس طرح جینے کی طاقت نہیں رکھتے، لیکن پرہیزگاری، انتھک کوشش، پاکدامنی اور استقامت کے ذریعے میری مدد کرو)*۔

علوی سیاسی عمرانیات کے نقطۂ نظر سے، حکمرانوں اور نخبگان کا طرزِ حیات تمام سماجی طبقات کے لیے نمونۂ عمل بنتا ہے۔ اگر حکمران اور ذمہ داران اشرافیہ پسندی کا شکار ہو جائیں تو معاشرے میں زہد، ہمدردی، مواسات اور سادگی کی روح فنا ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ مغرب کا فخر و نمائش پر مبنی صارفانہ ماڈل جڑ پکڑ لیتا ہے۔

ج) سماجی و سیاسی لایہ

پہلے دو محاذوں پر یلغار کا حتمی مقصود امت کے سماجی اتحاد اور سیاسی ارادے کو چکنا چور کرنا ہے۔ خطبہ ۱۹۲ (خطبۂ قاصعہ) اقوام اور انسانی تمدنوں کے زوال اور انحطاط کے تاریخی و فلسفیانہ علل و اسباب کا عمیق ترین تجزیہ فراہم کرتا ہے۔

علامہ محمد حسین طباطبائی ایمانی معاشرے کے تجزیے میں فرماتے ہیں کہ الٰہی اور سماجی سنن اسی وقت تک قائم رہتی ہیں جب تک امت کی فکری اور باطنی بنیادیں تغیر کا شکار نہ ہوں: اقوام کا ثقافتی انحطاط اور زوال براہِ راست افرادِ معاشرہ کے باطنی ادراکات، نیتوں اور رجحانات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتا ہے (طباطبائی ۱۳۹۰ھ، ۱۱: ۳۱۰)۔ اسی طرح آیت اللہ جوادی آملی تحریر فرماتے ہیں: ایمانی رشتوں میں انتشار اور پھوٹ، غیروں کے غلبے اور بااصالت سماجی شناخت کے مسخ ہونے کا سب سے بڑا پیش خیمہ ہے" (جوادی آملی ۱۳۸۶، ۱۸۵)۔

امام علیہ السلام نے اقوامِ سلف کے عروج، شوکت اور اقتدار کا راز کلمۂ وحدت اور ان کے زوال کا سبب تفرقہ بازی اور احساسِ کمتری کو قرار دیا ہے: «فَانْظُرُوا إِلَی مَا صَارُوا إِلَیْهِ فِی آخِرِ أُمُورِهِمْ، حِینَ وَقَعَتِ الْفُرْقَةُ، وَ تَشَتَّتَتِ الْأُلْفَةُ، وَ اخْتَلَفَتِ الْکَلِمَةُ وَ الْأَفْئِدَةُ، وَ تَشَعَّبُوا مُخْتَلِفِینَ، وَ تَفَرَّقُوا مُتَحَارِبِینَ؛ قَدْ خَلَعَ اللَّهُ عَنْهُمْ لِبَاسَ کَرَامَتِهِ، وَ سَلَبَهُمْ غَضَارَةَ نِعْمَتِهِ، وَ بَقِیَ قَصَصُ أَخْبَارِهِمْ فِیکُمْ عِبَراً لِلْمُعْتَبِرِینَ» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۱۹۲، ص ۲۹۸)۔ *(پس غور کرو کہ ان کے امور کا انجام کیسا عبرتناک ہوا جب ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی، ان کی باہمی الفت تتر بتر ہو گئی، ان کی باتیں اور دل ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے، وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے اور باہم برسرپیکار ہو کر انتشار کا شکار ہوئے؛ تب اللہ تعالیٰ نے ان کے بدن سے اپنی عزت و کرامت کا لباس اتار لیا، اپنی نعمتوں کی شادابی ان سے چھین لی، اور ان کے احوال کی کہانیاں تمہارے درمیان عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے بطورِ درس باقی رہ گئیں)*۔

یہ فرمانِ مبارک سامراجی قوتوں کے اس دیرینہ فارمولے ـــ تقسیم کرو اور حکومت کرو ـــ کی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے: دشمن لسانی، مسلکی اور طبقاتی خلیج کو ہوا دے کر معاشرے کے سماجی سرمائے کو تاراج کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تاریخی مفاخر اور دینی شناخت کی تحقیر کے ذریعے

قوم کو ثقافتی خود بیگانگی کے کنویں میں دھکیل دیتا ہے۔ جو معاشرہ نفسیاتی طور پر دشمن کے سامنے سرنگوں ہو جائے، وہ عسکری حملے سے کہیں پہلے اپنے اندر سے غلام اور نوآبادی بن چکا ہوتا ہے۔

علوی فقہ الحکمرانی کی روشنی میں ثقافتی یلغار کے مقابلے میں دفاعی حکمت عملی

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کسی دفاعی ماڈل کی تشکیل سے قبل، بحران زدہ معاشرے کی عمیق اور باریک بینانہ سماجی نبض شناسی (آسیب شناسی) فرماتے ہیں۔ کسی بھی دفاعی نظام کی کامیابی کا دار و مدار معاشرتی کمزوریوں کے درست ادراک پر منحصر ہے؛ کیونکہ ثقافتی نقب زنی کا امکان اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب معاشرے کا باطنی تانا بانا اخلاقی اور طرزِ حیات کی پامالی کا شکار ہو چکا ہو۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نہج البلاغہ کے خطبہ ۳۲ میں معاشرے کے شہریوں کو ان کے باطنی رجحانات اور اخلاقی فضائل سے انحراف کے تناسب سے چار طبقات میں تقسیم فرماتے ہیں:

1. گناہ کی قدرت نہ رکھنے والے (مجبور اب گناہ افراد

وہ افراد جو ظلم اور فساد کے مرتکب تو نہیں ہوتے، مگر ان کے رویے کی یہ پاکیزگی باطنی تقویٰ اور ذاتی ضبطِ نفس کا نتیجہ نہیں ہوتی؛ بلکہ ان کی یہ پارسائی پست ہمتی، عزم کی کمزوری («كَلَالَةُ حَدِّه») اور وسائل کی رکاوٹ بننے والی ناداری و مفلسی («نَضِيضُ وَفْرِه») کی مرہونِ منت ہے۔ عمرانیاتی اصطلاح میں یہ طبقہ بالقوہ فساد کے پذیروں پر مشتمل ہے؛ جنہیں جیسے ہی موقع اور وسائل میسر آئیں، وہ فضیلت کی حدود کو پامال کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۳۲، ص ۷۴)۔

2. کھلم کھلا شریر اور دین فروش:

وہ گروہ جس نے دشمنی کی تلوار برہنہ کر رکھی ہے اور فساد و دین ستیزی کو علی الاعلان اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ دین اور عقیدے کا اصل سرمایہ چند روزہ مادی منافع ـــ مثلاً کسی گھڑ سوار دستے کی کمان، سرکاری منصب یا منبرِ خطابت پر براجمان ہونے ـــ کے عوض لٹا دیتے ہیں۔ امام علیہ السلام اس سودے بازی کو عقل و شعور کا خسارہ خیز ترین تبادلہ قرار دیتے ہیں: «وَ لَبِئْسَ الْمَتْجَرُ أَنْ تَرَى الدُّنْيَا لِنَفْسِكَ ثَمَناً، وَ مِمَّا لَكَ عِنْدَ اللَّهِ عِوَضاً» (ایضاً)۔ *(اور کیسی بری تجارت ہے کہ تم دنیا کو اپنی جان کی قیمت سمجھو اور جو جزا اللہ کے پاس تمہارے لیے رکھی ہے اس کا بدل اسے قرار دو)*۔

3. مقدس مآب اور ریاکار

وہ لوگ جنہوں نے آخرت کے اعمال (نماز، روزہ اور زاہدانہ نمود و نمائش) کو دنیاوی مفادات کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ یہ قشر ظاہری دین داری کو دنیاوی لالچ کا نقاب بناتی ہے، خود کو امانت دار ظاہر کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی پردہ پوشی («سِتْرَ اللّٰہ») کو گناہوں کے ارتکاب کی سیڑھی بناتی ہے۔ (ایضاً)۔

4. محرومیت کے مارے زاہد نما (جبری قناعت پسند):

وہ افراد جو ہمت کی پستی اور اثر و رسوخ کے وسائل سے محرومی کے باعث دنیاوی زرق و برق حاصل کرنے سے قاصر رہے، لیکن انہوں نے اپنی اس بے بسی اور مجبوری کو قناعت کا دلکش نام دے رکھا ہے اور زہد کا لباس اوڑھ لیا ہے؛ درحالیکہ ان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں دنیا کی شدید ہوس موجزن ہے۔ (ایضاً، ص۷۵)۔

یہ تنقیدی عمرانیات یہ ثابت کرتی ہے کہ جنگِ نرم کی کاری ضرب اسی وقت اثر انداز ہوتی ہے جب معاشرے کا اخلاقی سرمایہ زوال پذیر ہو جائے اور حقیقی ایمان کی جگہ ریاکاری، مفاد پرستی اور جبری انفعالیت لے لے۔ اسی تناظر میں امیر المؤمنین علیہ السلام ثقافتی مدافعت کے نظام کو تقویت بخشنے کے لیے ایک جامع دفاعی اسٹریٹجی مرتب فرماتے ہیں:

ا۔ اعتقادی بنیادوں کا استحکام اور توحیدی جہان بینی کی تشکیل

کسی بھی تمدن کے دفاعی نظام کا انحصار اس کی کائناتی جہان بینی پر ہوتا ہے۔ جس معاشرے نے کائنات اور انسان کے مبدإ و معاد کے وجودی سوالات کے تشفی بخش جوابات عقلِ قدسی کی روشنی میں حاصل کر لیے ہوں، وہ لایعنیت، وجودی بے معنویت (Nihilism) اور لذت پرستانہ صارفیت کے حملوں کے سامنے ناقابلِ تسخیر ہو جاتا ہے۔ منہجِ علوی میں توحید محض ایک ذہنی علمِ کلام کا قضیہ نہیں ہے، بلکہ تمدن کا محرک انجن اور فکری نظم کا سنگِ بنیاد ہے: «أَوَّلُ الدِّينِ مَعْرِفَتُهُ، وَ كَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِيقُ بِهِ، وَ كَمَالُ التَّصْدِيقِ بِهِ تَوْحِيدُهُ...» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۱، ص۳۹)۔ *(دین کی ابتدا اللہ کی معرفت ہے، معرفت کا کمال اس کی تصدیق ہے، اور تصدیق کا کمال اس کی توحید کا اقرار کرنا ہے...)*۔

معرفت سے تصدیق اور پھر توحید کے نقطۂ عروج تک کا یہ سفر ایک ایسا استدلالی اور عقلانی عمل ہے جو انسانی ذہن کو اندھی تقلید کے دائرے سے نکال کر برہانی و استدلالی یقین تک پہنچاتا ہے؛ ایک ایسا پختہ ایمان جسے شبہات کے تند و تیز جھکڑ متزلزل نہیں کر سکتے۔ حضرت اس حیاتی محاذ پر لغزش اور کمزوری کے نتائج سے خبردار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «فَتَزِيغُ قُلُوبٌ بَعْدَ اسْتِقَامَةٍ» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۱۵۱، ص۲۱۰)۔ *(پس دل ثابت قدمی اور پائیداری کے بعد کجی اور انحراف کا شکار ہو جاتے ہیں)*۔

عقیدے کا قلعہ جنگ کا پہلا دفاعی مورچہ ہے؛ اگر یہ مورچہ گر جائے تو طرزِ عمل اور سماجی زندگی کے دیگر تمام عناصر کی مانند یکے بعد دیگرے زمین بوس ہو جاتے ہیں۔

۲۔ سچ اور جھوٹ پرکھنے کی صلاحیت اور میڈیا کی سوجھ بوجھ کی تربیت

جنگِ نرم کا مرکزی حربہ عمومی ادراک کے فضا کو دھندلا اور تاریک کرنے کے لیے مسلسل "شبہات" کی تخم ریزی کرنا ہے۔ اس غبار کو چھانٹنے کے لیے صیقل شدہ عقل اور بصیرت افروز شعور کے سوا کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہو سکتا۔ امام علی علیہ السلام ناآگاہانہ اور کورانہ تقلید کی قطعی نفی فرماتے ہیں اور باضابطہ تعقل و تفکر کو فکری کنشگری کی بنیاد قرار دیتے ہیں: «لَا غِنَى كَالْعَقْلِ» (شریف الرضی ۱۴۱۴، حکمت ۵۴، ص ۴۷۸)۔ *(عقل و دانائی جیسی کوئی ثروت اور بے نیازی نہیں ہے)*۔

حضرت تحلیلی و تجزیاتی فہم اور تنقیدی تفکر کے بنیادی ارکان کو یوں تبیین فرماتے ہیں: «إِنَّمَا الْبَصِيرُ مَنْ سَمِعَ فَتَفَكَّرَ، وَ نَظَرَ فَأَبْصَرَ، وَ انْتَفَعَ بِالْعِبَرِ» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۱۵۳، ص ۲۱۳)۔ *(در حقیقت بصیرت مند اور بینا وہ ہے جو سنے تو غور و فکر کرے، دیکھے تو گہری نگاہ ڈالے، اور عبرتوں سے نصیحت حاصل کرے)*۔

اگرچہ عصری میڈیا لٹریسی کا دائرہ کار بالعموم خبروں کی جانچ اور ابلاغی مہارتوں تک محدود ہے، تاہم امیر المؤمنین (علیہ السلام) کے مکتبِ فکر میں میڈیا لٹریسی محض ایک تکنیکی مہارت نہیں، بلکہ یہ عقلِ بصیرت کے احیاء کا نام ہے۔ امام (ع) کا مذکورہ فرمان اس بات کا غماز ہے کہ حقیقی میڈیا لٹریسی دراصل سماعت اور 'نظارت کے مرحلے سے گزر کر تفکر اور بصیرت تک پہنچنے کا نام ہے۔ پس، آج کے دور میں ثقافتی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے میڈیا لٹریسی کا جوہری مغز محض انفارمیشن کا تجزیہ نہیں، بلکہ حق و باطل کو تمیز دینے والی وہ 'ایمانی عقلانیت' ہے جو فتنہ کے دور میں تذبذب کا شکار نہیں ہوتی۔

۳۔ تاریخی اور تمدنی ورثے کی احیاء

ثقافتی یلغار کا سب سے بڑا حربہ معاشرے کی شناخت کو مٹانے کے لیے تاریخی احساسِ کمتری اور خود بیگانگی کا زہر گھولنا ہے، تاکہ نئی نسل اپنی تمدنی میراث کو حقیر اور فرسودہ سمجھے اور مفتوحانہ ذہنیت کے ساتھ حملہ آور تمدن کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ اس ذہنی مفلوجی کا شافی علاج تاریخی خود آگاہی کو بیدار کرنا اور نسلِ نو کا تعلق فضیلت کے تمدنی میناروں سے جوڑنا ہے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام خطبۂ قاصعہ میں اس منطق کو معاشرے کے سامنے مجسم فرماتے ہیں: «فَاعْتَبِرُوا بِمَا كَانَ مِنْ فِعْلِ اللَّهِ بِهِمْ إِذْ رَاعَى حَقَّ طَاعَتِهِ، وَ أَدْرَكَ الْعَافِيَةَ فِي صَبْرِهِمْ عَلَى لَأْوَائِهِمْ... فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانُوا حَيْثُ كَانَتِ الْأَمْلَاءُ مُجْتَمِعَةً، وَ الْأَهْوَاءُ مُؤْتَلِفَةً، وَ الْقُلُوبُ مُعْتَدِلَةً... أَلَسْتُمْ تَرَوْنَهُمْ كَانُوا أَرْبَاباً فِي أَقْطَارِ الْأَرَضِينَ، وَ مُلُوكاً عَلَى رِقَابِ الْعَالَمِينَ؟!» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۱۹۲، ص ۲۹۷)۔

(پس عبرت حاصل کرو ان اقوام کے بارے میں اللہ کے طرزِ عمل سے جب انہوں نے اس کی اطاعت کا حق ادا کیا اور سختیوں پر صبر کے نتیجے میں عافیت پائی... دیکھو وہ کیسی شوکت کے مالک تھے جب ان کی جماعتیں باہم متحد، ارادے ہم آہنگ اور دل باہم شیر و شکر تھے... کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ روئے زمین کے کناروں کے سردار اور جہانوں کی گردنوں کے فرماں روا بن گئے تھے؟!)۔

یہ فرمانِ عالی شان دراصل ثقافتی تحقیر کے مرض کا اکسیر نسخہ ہے۔ جب معاشرہ اپنے عظیم تمدنی ورثے کی گہرائی کا ادراک کر لیتا ہے اور سیرتِ رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بصیرت مندانہ مطالعہ کرتا ہے، تو وہ اجنبی ماڈلز کی اندھی تقلید کے بجائے اپنی تاریخی اصالت اور تشخصی خود اعتمادی کو دوبارہ پالیتا ہے۔

ثقافتی یلغار کے مقابلے میں امیر المؤمنین علیہ السلام کی پیشگی و اقدامی حکمتِ عملی

نہج البلاغہ کا تمدنی نظام کبھی بھی محض انفعالی دفاع، ثقافتی تنہائی پسندی یا تاریخی حاشیہ نشینی پر اکتفا نہیں کرتا۔ ایک زندہ، فعال اور گہری جڑیں رکھنے والا تمدن اس بات کا پابند ہے کہ وہ شناختی و دفاعی حصار بندی کے ساتھ ساتھ خلاقانہ، ایجابی اور تعمیری کردار کا مظاہرہ کرے اور اپنے فکری و معنوی افق کو انسانی زیست جہان کے سامنے بطورِ نمونہ پیش کرے۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام ان اقدامی اور پیشگی اسٹریٹیجیز کی بنیاد رکھ کر اسلامی معاشرے کو انفعالی و دفاعی پوزیشن سے نکال کر نرم قوت کے متحرک و فعال قطب اور تمدنی محرک میں تبدیل فرما دیتے ہیں۔

ا۔ متبادل تمدنی نمونے کا تعارف و ترویج

مغربی ثقافتی یلغار اور اس کے استعماری غلبے کے مقابلے کا پائیدار ترین اور مؤثر ترین طریقہ صرف نفی اور ردِ عمل پر تکیہ کرنا نہیں ہے؛ بلکہ ایک ایسے متبادل طرزِ حیات اور نظامِ حکمرانی کی تدوین اور اسے عملی طور پر پیش کرنا ہے جو زیادہ کارآمد، زیادہ عادلانہ اور انسان کی بااصالت فطرت کے تقاضوں سے مکمل ہم آہنگ ہو۔ کسی مثبت اور عملی ماڈل کی تعمیر کے بغیر محض نفی و انکار پر اصرار، بالآخر سماجی مایوسی اور بند گلی پر منتج ہوتا ہے۔

مالک اشتر کے نام امیر المؤمنین علیہ السلام کا تاریخی فرمان (مکتوب ۵۳)، اخلاق محور، عدل اساس، عوام دوست اور ہمہ جہت ترقی یافتہ ریاست و معاشرے کی تشکیل کا بنیادی منشور ہے۔ یہ دستوری خاکہ قرونِ اولیٰ کے استبدادی و اشرافی نمونوں کا ساختار شکن جواب اور دور حاضر کے مادیت پسندانہ اور افادہ پرست ماڈلز کے مقابلے میں ایک جامع متبادل ہے۔ حضرت نے انسان کی تکریم اور اس سے محبت و ہمدردی کے اصول کو حاکمیت کے قلب میں یوں جاگزیں فرمایا: «وَ أَشْعِرْ قَلْبَکَ الرَّحْمَةَ لِلرَّعِيَّةِ، وَ الْمَحَبَّةَ لَهُمْ، وَ اللُّطْفَ بِهِمْ... فَإِنَّهُمْ صِنْفَانِ: إِمَّا أَخٌ لَکَ فِی الدِّينِ، وَ إِمَّا نَظِيرٌ لَکَ فِی الْخَلْقِ» (شریف الرضی ۱۴۱۴، مکتوب ۵۳، ص ۴۲۷)۔ *(رعایا کے لیے اپنے دل کو مہر و محبت اور لطف و عنایت کا گہوارہ بنا... کیونکہ وہ دو گروہوں پر مشتمل ہیں: یا تو دین میں تمہارے بھائی ہیں، یا خلقت و انسانیت میں تمہارے جیسے ہیں)*۔

یہ کلام توحیدی نظام کی نرم طاقت کے عروج اور کارآمدی کا مظہر ہے۔ ایسے عادلانہ، شفاف اور بدعنوانی سے پاک طرزِ حکمرانی کی عملی پیشکش، حریف تمدن کے پرفریب جلووں اور اس کی مصنوعی دلکشی کی بنیادوں کو منہدم کر دیتی ہے۔

۲۔نئے علم کی تخلیق اور اداروں کی ترقی (علمی بیداری کا دور)

پائیدار تمدنی بالادستی اور ثقافتی پیشوائی کا رشتہ علم و دانش کی پیداوار اور نوآوری میں صف اول پر رہنے سے وابستہ ہے۔ جو معاشرہ غیروں کے علمی دستاور کا دست بستہ اور بالاچوں وچرا وابستہ بن جائے، وہ لامحالہ ان علوم کے اندر پوشیدہ نظریاتی و ثقافتی پیوستوں کو بھی غیر شعوری طور پر قبول کر لے گا۔ اس کے برعکس، جو معاشرہ معرفت اور اجتہاد کے خود رو چشموں کی رہنمائی کرتا ہے، وہ اپنے ثقافتی رسوخ کو عقلانی بنیادوں پر عالمگیر وسعت دیتا ہے۔

مسجدِ کوفہ کے وسیع ایوان میں امام علی علیہ السلام کی یہ تاریخی اور ولولہ انگیز صدا: «سَلُونِی قَبْلَ أَنْ تَفْقِدُونِی، فَلَأَنَا بِطُرُقِ السَّمَاءِ أَعْلَمُ مِنِّی بِطُرُقِ الْأَرْضِ...» (شریف الرضی ۱۴۱۴، خطبہ ۱۸۹، ص ۲۸۰)۔ *(مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ تم مجھے اپنے درمیان نہ پاؤ؛ کیونکہ میں زمین کے راستوں کی بہ نسبت آسمان کے راستوں کا زیادہ علم رکھتا ہوں...)*،

محض ایک ذاتی علمی فضیلت کا اظہار نہیں ہے؛ بلکہ عالمِ اسلام میں ایک ہمہ گیر فکری نشاۃالثانیہ کی داغ بیل ڈالنے اور سوال و جستجو اور پیداوارِ علم کی روایت کو ادارہ جاتی سطح پر مستحکم کرنے کی ایک اسٹریٹجک کوشش تھی۔ عہدِ علوی میں مسجدِ کوفہ محض انفرادی عبادات کی جگہ نہیں تھی، بلکہ ایک اوپن یونیورسٹی کی حیثیت رکھتی تھی جہاں کلامی، وجودی، قانونی، معاشی اور عمرانی مباحث پر اہل علم اور عامۃالناس کے مابین آزادانہ گفتگو اور علمی مکالمہ جاری رہتا تھا۔

۳۔ عوامی نگرانی اور خود احتسابی کا متحرک نظام

کوئی بھی سماجی ڈھانچہ اندرونی فرسودگی اور بیرونی نقب زنی سے اسی وقت محفوظ رہ سکتا ہے جب اس کے پاس ایک متحرک خود اصلاحی نیٹ ورک موجود ہو۔ علوی سماجی فقہ میں "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" اس سماجی مدافعتی نظام کا ستونِ اعظم ہے۔ جو معاشرہ عمومی نگرانی اور باہمی احتساب کو ترک کر دے، وہ اندرونی طور پر کھوکھلا پن اور سیسٹمک فساد کا شکار ہو جاتا ہے اور کسی بھی معمولی بیرونی جھٹکے سے زمین بوس ہو جاتا ہے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نے دیگر تمام دینی فرائض اور اعمال کے تقابل میں اس تمدن ساز فریضے کی عظمت کو یوں واضح فرمایا: «وَ مَا أَعْمَالُ الْبِرِّ كُلُّهَا وَ الْجِهَادُ فِی سَبِیلِ اللَّهِ عِنْدَ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّهْیِ عَنِ الْمُنْكَرِ، إِلَّا كَنَفْثَةٍ فِی بَحْرٍ لُجِّیٍّ...» (شریف الرضی ۱۴۱۴، حکمت ۳۷۴، ص ۵۴۲)۔ *(تمام نیک اعمال اور حتیٰ کہ راہِ خدا میں جہاد بھی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلے میں اتنی ہی حیثیت رکھتے ہیں جتنی کہ ایک اتھاہ اور گہرے سمندر کے سامنے لعاب کا ایک قطرہ...)*۔

یہ بلیغ تمثیل واضح کرتی ہے کہ اخلاقی انسجام، سماجی سلامت روی اور اندرونی استحکام کا تحفظ، نرم اور سخت جنگوں کے ہر میدان میں فتح کی بنیادی پیش شرط ہے۔

۴۔ جہاد تبیین کے بیانیے کی جنگ میں اقدامی حکمت عملی

جنگِ نرم کا مرکزی ستون حقائق کو مسخ کرنے، واقعات کو الٹ کر دکھانے اور صالح قیادت کے سماجی وقار کو تاراج کرنے پر استوار ہے۔ تسلط پسند استکباری نظام کے پروپیگنڈے کے سامنے خاموشی اور تذبذب، درحقیقت اپنی شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ اس فتنے کا تریاق بروقت اور سچا جہادِ تبیین، امانت دارانہ بیانیہ سازی اور باطل کی میڈیا کی اجارہ داری کو پاش پاش کرنا ہے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کے خطوط اور خطبات کی تشکیل کا معراج ہیں۔ اس کا درخشاں نمونہ معاویہ کے مغالطہ آمیز اور پروپیگنڈا خطوط کا وہ دندان شکن جواب ہے جس میں حضرت نے فرمایا: «وَ أَمَّا قَوْلُکَ: إِنَّا بَنُو عَبْدِ مَنَافٍ، فَکَذَلِکَ نَحْنُ، وَ لَکِنْ لَیْسَ أُمَیَّةُ کَهَاشِمٍ، وَ لَا حَرْبٌ کَعَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَ لَا أَبُو سُفْیَانَ کَأَبِی طَالِبٍ، وَ لَا الْمُهَاجِرُ کَالطَّلِیقِ، وَ لَا الصَّرِیحُ کَاللَّصِیقِ، وَ لَا الْمُحِقُّ کَالْمُبْطِلِ، وَ لَا الْمُؤْمِنُ کَالْمُدْغِلِ...» (شریف الرضی ۱۴۱۴، مکتوب ۲۸، ص ۳۸۶)۔ *(اور تیرا یہ دعویٰ کہ ہم سب عبد مناف کی اولاد ہیں؛ تو بے شک ایسا ہی ہے، لیکن یاد رکھ کہ امیہ کبھی ہاشم جیسا نہیں ہو سکتا، نہ حرب عبدالمطلب کا ہم پلہ ہے، نہ ابوسفیان ابوطالب کے برابر ہے، نہ اولین مہاجر اسیرِ آزاد شدہ (طلیق) کی مانند ہے، نہ خاندانی اصالت رکھنے والا مصنوعی الحاق شدہ کے برابر ہو سکتا ہے، نہ حق کا علمبردار باطل پرست جیسا ہے، اور نہ مخلص مومن مکار منافق جیسا ہو سکتا ہے...)*۔

امام علیہ السلام نے ماضی و حال کا حقیقت پسندانہ موازنہ کر کے شامی پروپیگنڈے کی پھیلائی ہوئی افواہوں اور مغالطوں کے غبار کو چھانٹ دیا، نفسیاتی جنگ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور باطل کے اوہام کو بے نقاب کر دیا۔ یہ طرزِ عمل عصری علمی اصطلاح میں درست طور پر علم شناختی جنگوں میں فتح حاصل کرنے کا بنیادی نمونہ ہے۔

حاصل تحقیق

نہج البلاغہ کے فکری و تمدنی افق میں ثقافتی یلغار کے مقابلے کے موضوع پر اس تحقیق کے بنیادی نتائج درج ذیل نکات کی صورت میں اخذ کیے جا سکتے ہیں:

1. جنگِ نرم کے بحران سے نجات جذباتی نعروں، معاشرے کو بیرونی دنیا سے کاٹ کر بند کرنے، یا رجعت پسندانہ تحجر کے ذریعے ممکن نہیں ہے؛ بلکہ اس کے لیے ایک منظّم معرفتی اور اسٹریٹجک فریم ورک درکار ہے جس کا کامل ترین منشور نہج البلاغہ نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔
2. امتِ مسلمہ کی تہذیبی و تشخصی خود مختاری کا انحصار بیک وقت دو ہمہ گیر اسٹریٹجیز کے نفاذ میں مضمر ہے:

- دفاعی اسٹریٹجی: توحیدی جہان بینی کا استحکام، تنقیدی عقلانیت و میڈیا لٹریسی کا فروغ، اور تاریخ و اصالت کی باوقار بازیابی؛ جو معاشرے کے باطنی مدافعتی نظام کو شبہات کے نفوذ کے سامنے ناقابلِ تسخیر بنا دیتی ہے۔

- پیشگی و اقدامی اسٹریٹجی: عدل اساس و کارآمد حکمرانی کا ماڈل پیش کرنا (مکتوب ۵۳)، پیداوارِ علم میں سبقت، معاشرتی خود اصلاحی کا ادارہ جاتی نفاذ، اور بیانیوں کی جنگ میں تبیینِ حقائق؛ جو معاشرے کو ایک دفاعی پوزیشن سے نکال کر عالمی سطح پر ایک پرکشش اور تحول آفریں سافٹ پاور میں تبدیل کر دیتا ہے۔

3. نہج البلاغہ غالب استکباری ثقافتوں کے سامنے مرعوبیت اور انفعالیت کے طلسم کو توڑ کر مسلم انسان کو وقار، خود آگاہی اور تمدنی فعال کی دعوت دیتا ہے۔ یہ صحیفۂ حکمت واضح کرتا ہے کہ عصر حاضر کی فکری غلامی سے نجات کا واحد راستہ ان الٰہی تعلیمات کی طرف معرفتی رجعت اور ان کا انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں مدبرانہ اور عقلانی اطلاق ہے۔

کتابیات

ابن ابی الحدید، عبد الحمید بن ہبۃ اللہ۔ ۱۳۸۵—۱۳۸۷ھ۔ *شرح نہج البلاغۃ*۔ تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم۔ ۲۰ جلد۔ بیروت: دار إحیاء الکتب العربیۃ۔

- ابن منظور، محمد بن مکرم۔ ۱۴۱۴ھ۔ *لسان العرب*۔ تصحیح جمال الدین میر دامادی۔ ۱۵ جلد۔ بیروت: دار صادر۔
- پورسید، بہزاد۔ ۱۳۹۰۔ «مفہوم شناسی قدرت نرم در نہج البلاغہ»۔ *فصلنامہ مطالعات قدرت نرم*، دورہ ۱، شمارہ ۲: ۴۵—۶۸۔
- جعفری، محمد تقی۔ ۱۳۵۷—۱۳۶۷۔ ترجمہ و تفسیر *نہج البلاغہ*۔ ۲۷ جلد۔ تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی۔
- جعفری، محمد تقی۔ ۱۳۷۳۔ *فرہنگ پیرو، فرہنگ پیشرو*۔ تہران: انتشارات علمی و فرہنگی۔
- جوادی آملی، عبد اللہ۔ ۱۳۸۶۔ *جامعہ در قرآن (تفسیر موضوعی قرآن کریم، جلد ۱۷)*۔ تنظیم و ویرائش مصطفی خلیلی۔ قم: نشر اسراء۔
- خامنہ ای، سید علی۔ ۱۳۹۲۔ *دغدغہ ہای فرہنگی: شرح و تبیین بیانات مقام معظم رہبری در شیراز*۔ تدوین مؤسسہ فرہنگی جہادی (صہبا)۔ تہران: انتشارات صہبا۔
- دورانت، ویلیم جیمز (ویل)۔ ۱۳۶۵۔ *تاریخ تمدن*۔ ترجمہ احمد آرام، عسکری پاشائی و دیگران۔ تہران: انتشارات علمی و فرہنگی۔
- زرشناس، شہریار۔ ۱۳۸۸۔ *مبانی جنگ نرم*۔ تہران: کانون اندیشہ جوان۔

- شریف الرضی، محمد بن حسین۔ ۱۴۱۴ھ۔ *نہج البلاغۃ*۔ تصحیح صبحی صالح۔ قم: دار الہجرۃ۔
- طباطبائی، سید محمد حسین۔ ۱۳۹۰ھ۔ *المیزان فی تفسیر القرآن*۔ ۲۰ جلد۔ بیروت: مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات۔
- کلینی، محمد بن یعقوب۔ ۱۴۰۷ھ۔ *الکافی*۔ تصحیح علی اکبر غفاری و محمد آخوندی۔ ۸ جلد۔ تہران: دار الکتب الإسلامیۃ۔
- مجلسی، محمد باقر۔ ۱۴۰۳ھ۔ *بحار الأنوار الجامعۃ لدرر اخبار الأئمۃ الأطہار*۔ ۱۱۰ جلد۔ بیروت: دار إحیاء التراث العربی۔
- مصباح یزدی، محمد تقی۔ ۱۳۸۰۔ *تہاجم فرہنگی*۔ قم: انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی (رہ)۔
- مطہری، مرتضی۔ ۱۳۷۲۔ *سیری در نہج البلاغہ*۔ ایڈیشن گیارہواں۔ تہران: انتشارات صدرا۔
- مطہری، مرتضی۔ ۱۳۸۹۔ *نظام حقوق زن در اسلام*۔ ایڈیشن پچپنواں۔ تہران: انتشارات صدرا۔
- نائے، جوزف۔ ۱۳۸۷۔ *قدرت نرم: ابزارہای موفقیت در سیاست بین الملل*۔ ترجمہ محسن روحانی و مہدی ذوالفقاری۔ تہران: انتشارات دانشگاہ امام صادق (ع)۔